رِبٰو اور رِبح میں فرق

محمد طاسین

ربٰو اور ربح عـربی کے دو مختلف الفـاظ ہیں دونوں کا معنٰی ، مطلب اور مفہوم و مصـداق بھی ایـک دوسـرے سے جـدا ہے اور شـرعی حکم بھی ایک دوسرے سے متضاد اور الگ : اگـر ایک حـرام ہے تو دوسرا حـلال ، لیکن بدقسمتی سے حال یہ ہے کہ اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بھی اس فـرق و امتیاز کو نہیں جانتے جـو ان کے شـرعی مفہوم و مطلب کے مابین پایا جاتا ہے نتیجہ یہ کہ آج بہت سے دیندار مسلمان نادانی کی وجہ سے ربٰو کو ربح سمجھتے ہوئے اس کے لین دین میں ملوّث ہیں حالانکہ ربٰو سے انہیں نفرت ہے اور اس سے بچنا ضـروری سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا ایک ایسے مضمون کی ضرورت محسـوس ہوئی جس میں ربٰو اور ربح کے فـرق و امتیاز کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ جو مسلمان ربٰو سے بچنا چاہتے ہوں بچ سکیں ۔

ربٰو اور ربح کے مابین جو فـرق و اختلاف ہے اس کا اظـہار دوسری زبانوں میں ان کے ترجموں سے بھی ہوتا ہے مثلاً ربٰو کا ترجمہ سود ، بیاج ، انٹرسٹ اور یوزری ہے جب کہ ربح کا تـرجمہ نفـع ، فـائدہ اور پرافٹ ہے پھـر جـو فـرق سود اور نفع اور انٹـرسٹ و پرافٹ کے مابیـن ہے وہی فـرق ربٰو اور ربـح کے مابین بھـی ہے ۔

چونکہ ربٰو اور ربح کے شـرعی مفہوم و معنی کا ان کے لغـوی معنی و مفہوم سے گہرا تعلق ہے لہٰذا شـرعی معنـی و مفہوم کی

توضیح کے لئے ان کے لغوی معنی و مفہوم کی کچھ وضاحت پیش کی جاتی ہے ۔ عربی لغت کی مستند کتابوں : جیسے لسان العرب (ص۱۷ و ۱۸ ۔ ج ۱۹) تاج العروس (ص ۱۳۲ و ۱۳۳ ۔ ج ۱۰) الصحاح للجوهری (۲۳۵۰ ۔ ج ٦) اساس البلاغة للزمحشری (ص ۱۵۳) معجم مقائیس اللغة (ص ۴۸۳ و ۴۸۴ ۔ ج ۲) المفردات للراغب (ص ۱۸۵) النهایة فی غریب الحدیث للجزری (ص ٦٦ ۔ ج ۲) وغیرہ میں لفظ ربوٰ کی جو تفصیل ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حرف رآء ، بآء اور واؤ و یآء سے مرکب تمام الفاظ و کلمات میں زیادتی، بڑھوتری ، ارتفاع و بلندی کے معنی پائے جاتے ہیں خواہ وہ زیادتی، بڑھوتری اور بلندی مقدار اور حجم کے لحاظ سے ہو یا کیفیت و صفت کے لحاظ سے ، کتب مذکورہ میں اس کے جو استعمالات و اطلاقات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں :,, ربا المال ،، اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ تعداد و مقدار میں بڑھ گیا ہو ، ,, ربا علی الخمسین ،، اس شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جس کی عمر پچاس برس سے بڑھ گئی ہو ، ,, ربا السویق ،، کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب پانی پڑنے سے ستو پھول گئے ہوں ، اسی طرح ,, ربت الارض ،، ۔ اس زمین کے متعلق کہا جاتا ہے جو بارش وغیرہ کے پانی سے نرم ہو کر پھول جاتی ہے ، ,, اربیٰ فلان علی فلان ،، کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی قول و عمل میں ایک دوسرے سے بڑھ جائے ، ,, ربا الفرس ،، اس گھوڑے کے متعلق کہا جاتا ہے جس کا دوڑنے سے سانس پھول گیا اور ہانپنے لگا ہو ۔ ,, ربا فی حجرہ ،، کا اطلاق اس بچے کے بارے میں ہوتا ہے جو کسی کی گود

میں پلا بڑھا ہو ، ,, ربا الجرح ،، اس زخم کے متعلق بولا جاتا ہے جس میں ورم آ گیا ہو۔ ربوۃ ، رابیۃ اور مرباۃ اس خطۂ زمین کو کہا جاتا ہے جو مرتفع و اونچی ہو۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں بھی یہ لفظ جہاں جہاں اور جن جن شکلوں اور صیغوں سے استعمال ہوا ہے ان سب کے اندر بھی وھی زیادتی ، اضافے اور ارتفاع کے معنی پائے جاتے ھیں ، قرآن مجید کی متفرق آیات میں اس مادہ سے جو کلمات ذکر ہوئے ھیں وہ یُربِی، یَربُو ، رَبَت ، اَربی ، رَبوَۃ ، رَابِیَۃ ، اور رَابِیاً ، رِباً ھیں اور یہ سب کلمات مذکورہ معنوں پر دلالت کرتے ھیں یعنی زیادتی ، بڑھوتری اور ارتفاع و بلندی پر۔

اسی طرح لفظ الربح کے متعلق لغت کی کتب مذکورہ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ھے اس سے بھی صاف طور پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ الربح کے معنی بھی زیادتی ، بڑھوتری اور اضافے کے ھیں لیکن عام اور مطلق زیادتی بڑھوتری اور اضافے کے نہیں بلکہ صرف اس زیادتی و اضافے کے ھیں جو تجارت سے مخصوص اور جس کا حصول بیع و شراء اور تجارت کے معاملہ میں منافع کی صورت میں ہوتا ہے، مثلاً معجم مقائیس اللغۃ لابن فارس میں لکھا ہے ,, الراء والباء والحاء اصل واحد یدل علی شف فی مبایعۃ من ذلک ربح فلان فی بیعہ اذا اشتف ،، (ص ۴۷۳ ـ ج ۲) حرف راء ، باء اور حاء کے مرکب کا ایک ھی بنیادی معنی ہے جو بیع و شراء میں حاصل ہونے والی زیادتی پر دلالت کرتا ہے چنانچہ جب کسی کو بیع و شراء میں نفع حاصل ہوا ہو تو کہا جاتا ہے :,, ربح فلان فی بیعہ ،، لسان العرب اور تاج العروس میں لکھا ہے : ,, الربح والربح والرباح

النماء فی التجارۃ » (ص ۲٦۷ ـ ج ۳ لسان) (ص ۱۳۰ ـ ج ۲ تاج)
یقال :,, ربح فی تجارته اذا استشف » یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے
جب کسی کو تجارت میں نفع حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جس بیع و
شراء اور تجارت میں کسی کو نفع حاصل ہوا ہو اسے بیع مربح اور
تجارۃ رابحة کہا جاتا ہے گویا ربح کی نسبت گاہے تاجر کی طرف
اور گاہے تجارت کی طرف کی جاتی ہے ، ربح ورباح کا اختصاص
تجارت و بیع سے ہے اس پر وہ مشہور جملہ بھی دلالت کرتا ہے جس
سے عرب اس شخص کو مخاطب کرتے اور دعا دیتے ھیں جو تجارتی
کاروبار شروع کرتا اور اس میدان میں قدم رکھتا ہے وہ دعائیہ جملہ
یہ ہے :,, بالرباح والسماح » ۔ امام راغب اپنی مشہور کتاب مفردات
القرآن میں ربح کے متعلق لکھتے ھیں :,, الربح الزیادۃ الحاصلة فی
المبایعة ثم یتجوز به فی کل ما یعود من ثمرۃ عمل » (ص ۱۸۴)
ترجمہ : ربح دراصل نام ہے مال کی اس زیادتی کا جو تجارت و خرید
و فروخت کے کام میں حاصل ہوتی ہے ، پھر مجازاً اس کا اطلاق ہر
ایسی شے پر ہوتا ہے جو کام و عمل سے بطور ثمرہ ونتیجہ حاصل ہوتی
ہے یعنی عمل کے پھل پر ، قرآن مجید کی آیت ہے :"فما ربحت
تجارتهم"پس ان کی تجارت نفع بخش نہ ہوئی ۔ اس سے بھی ظاہر
ہوتا ہے کہ ربح کا تعلق تجارت سے ہے۔ یعنی وہ صرف اس زیادتی و
بڑھوتری کا نام ہے جو تاجر کو تجارت میں اس کے اصل سرمائے پر
حاصل ہوتی ہے ، چنانچہ معاملہ قرض میں قرض کے اصل مال پر جو
زائد لیا جاتا ہے وہ ربح کی تعریف میں نہیں آتا اور اسے ربح کہنا
صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ معاملہ قرض اپنی حقیقت اور اپنی

غرض و غائیت کے لحاظ سے معاملہ بیع و تجارت سے ایک بالکل مختلف معاملہ ہے۔

ربوٰ اور ربح کی شرعی حقیقت :

شریعت اسلامی کا حقیقی مأخذ اور اصل سرچشمہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، عملی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف امور و مسائل سے متعلق قرآن و سنت میں جو احکام و قوانین ہیں ان کے مجموعے کا نام شریعت اسلام ہے۔ شریعت اسلام میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشی و اقتصادی شعبہ سے متعلق بھی واضح احکام ہیں جن کو اسلام کے معاشی و اقتصادی احکام کہا جاتا ہے ان معاشی و اقتصادی احکام کا براہ راست تعلق ان معاشی و اقتصادی امور و معاملات سے ہے جو ظہور اسلام اور نزول قرآن کے وقت عرب معاشرے میں موجود اور مروج تھے اور جن کو کاروباری لوگ خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے، قرآن حکیم اور رسول کریم ﷺ نے ان امور و معاملات میں سے کچھ کو حلال و جائز کہہ کر قائم و برقرار رکھا اور کچھ کو حرام و ناجائز ٹھہرا کر ان سے منع کیا اور روکا، چنانچہ پہلی قسم کے احکام ایجابی اور دوسری قسم کے احکام امتناعی ہیں۔

ظہور اسلام اور نزول قرآن کے وقت جو معاشی معاملات عرب معاشرے میں موجود و مروج اور عام طور پر جانے پہچانے اور متعارف تھے ان میں سے ایک معاملہ بیع کے نام سے اور دوسرا ربوٰ کے نام سے مشہور و معروف تھا، معاملۂ بیع کا مطلب تھا تجارت اور

خرید و فروخت کا معاملہ جس میں ایک تاجر شخص نفع کمانے کی غرض سے اشیاء ضرورت خریدتا اور بیچتا ہے ، بلکہ آج بھی دنیا بھر میں معاملۂ بیع و تجارت کا یہی مطلب سمجھا جاتا ہے ، اور معاملۂ ربوٰ کا مطلب تھا ایک فریق کا دوسرے کو اس شرط کے ساتھ قرض دینا خواہ نقد کی شکل میں یا کسی جنس کی شکل میں کہ قرض لینے والا فریق اضافے کے ساتھ اسے ادا کرے گا یعنی مہلت و تاخیر کے عوض وہ قرض کے اصل مال کے ساتھ کچھ مزید بھی ادا کرے گا ۔ عہد جاہلیت میں ربوٰ کا یہی وہ مطلب تھا جسے عرب عام طور پر جانتے پہچانتے اور جس پر عمل کرتے تھے اس کا اظہار علامہ ابوبکر الجصاص اور امام فخرالدین الرازی کی مندرجہ ذیل عبارات سے بخوبی ہوتا ہے :

والربوٰ الذی کانت العرب تعرفه وتفعله انما کان قرض الدراهم والدنانیر الی اجل بزیادة علی مقدار ما استقرضه علی ما یتراضون به، هذا کان المتعارف المشهور عندهم (۱) ۔

ترجمه : اور ربوٰ وہ جسے عرب جانتے اور کرتے تھے صرف یہ تھی کہ درہم اور دینار ایک خاص مدت تک قرض دیئے جاتے تھے قرض کی اصل مقدار پر کچھ زیادتی و اضافے کے ساتھ جس پر وہ متفق و رضامند ہو جاتے تھے ، یہی ربوٰ ان کے ہاں متعارف و مشہور تھی ۔

کچھ آگے دوسری عبارت اس طرح ہے :

ولم یکن تعاملهم بالربوٰ الا علی الوجه الذی ذکرنا من قرض دراهم و دنانیر الی اجل مع شرط الزیادة (۲) ۔

ترجمہ : اور نہیں تھا تعامل ان کا ربوٰ پر مگر اسی طریقہ سے جو ہم نے پہلے ذکر کیا یعنی دراھم و دنانیر کا قرض ایک مدت تک زیادتی کی شرط کے ساتھ۔

پھر دو صفحات کے بعد تیسری عبارت یوں ہے :

انه معلوم ان الربوٰ الجاهلية انما كان قرضا مؤجلا بزيادة مشروطة فكانت الزيادة بدلا من الاجل فابطله الله و حرمه وقال ان تبتم فلكم رؤوس اموالكم لاتظلمون ولاتظلمون (۳) ۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ربائے جاهلیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ میعادی قرض تھا جس کے ساتھ زیادتی کی شرط ہوتی تھی اور وہ زیادتی وقت و مدت کا عوض سمجھی جاتی تھی ، پس اللہ تعالیٰ نے اسے باطل ٹھہرایا اور حرام قرار دیا اور فرمایا اگر تم تائب ہو جاؤ تو تمہارے لئے صرف اصل مال ہیں نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

تفسیر الکبیر میں امام فخرالدین الرازی کی ایک عبارت حسب ذیل ہے :

اعلم ان الربوٰ قسمان : ربا النسية و ربا الفضل اما ربا النسية فهو الامر الذى كان مشهورا متعارفا فى الجاهلية و ذلک انهم كانوا يدفعون المال على ان يأخذوا كل شهر قدرا معينا ويكون رأس المال باقيا ، ثم اذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال ، فان تعذر عليه الاداء زادوا فى الحق والأجل فهذا هو الربا الذى كانوا فى الجاهلية يتعاملون به (۴) ۔

ترجمہ : معلوم ہونا چاهیئے کہ ربوٰ کی دو قسمیں ہیں ایک ربوٰ نسیة اور دوسری ربوٰ الفضل ، ربوٰ نسیة ہی وہ ربوٰ ہے جو عہد

جاهلیۃ میں ربوٰ کے نام سے مشہور و متعارف تھیٰ اور اس کی شکل یہ تھی کہ لوگ اپنا مال دوسروں کو اس شرط پر دیتے تھے کہ وہ ہر ماہ ان سے ایک متعین مقدار میں زائد مال لیتے رہیں گے جب کہ اصل مال ان کے ذمہ برقرار رہے گا اور واجب الاداء ہوگا ۔ پھر جب مدت قرض پوری ہو جاتی اور ادائیگی کا وقت آتا تو وہ اپنے مدیون و مقروض سے اصل مال کا مطالبہ کرتے ، اب اگر اس کے لئے ادائیگی مشکل ہوتی تو مزید مدت کے ساتھ اصل رقم بھی بڑھا دیتے ، پس یہی وہ ربوٰ تھی جس پر اسلام سے پہلے عہد جاهلیت میں لوگوں کا تعامل تھا ۔

اور دوسری عبارت امام رازی کی تفسیر کبیر میں اس طرح ہے :

کان الرجل فی الجاهلیة اذا کان له علی انسان مائة درهم الی الاجل فاذا جاء الاجل و لم یکن المدیون واجدا لذلک المال قال زدنی فی المال حتیٰ ازید فی الاجل فربما جعله مائتین (۵) ۔

ترجمه : اسلام سے پہلے عہد جاهلیت میں ایک آدمی کا کسی انسان پر ایک معین وقت تک سو درهم دین و قرض هوتا پھر جب اس معین وقت پر وہ انسان ادائیگی کے قابل نہ هوتا تو قرض خواه اس سے کہتا آپ رقم بڑھا دیجیئے میں مدت بڑھا دیتا هوں ، چنانچه اس طرح بعض دفعه سو درهم کے دو سو درهم هو جاتے ۔

ربوٰ جاهلی کے متعلق چونکه علامه الجصاص اور امام الرازی کی مذکوره بالا عبارتیں نہایت صاف اور واضح تھیں لہذا خصوصیت کے ساتھ نقل کی گئی هیں ورنه اسی قسم کی عبارتیں تفسیر جامع البیان للطبری ، تفسیر احکام القرآن للکیا الهراسی

الجامع لاحکام القرآن للقرطبی میں بھی موجود ھیں جو ربوٰ جاھلی کی صورت مذکور پر دلالت کرتی ھیں یعنی یہ کہ وہ دین و قرض کا کا معاملہ تھا جس میں مہلت و تاخیر کے عوض زائد مال لیا دیا جاتا تھا ۔

ربائے جاھلی کے متعلق مفسرین کرام نے جو لکھا اور ھم نے نقل کیا ہے ھو سکتا ہے اس کی بنیاد وہ روایات ھوں جو ربوٰ جاھلی کے متعلق بعض صحابہ اور تابعین سے مروی اور کتب حدیث و تفسیر میں مذکور ھیں مثلاً حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے :

عن زید بن اسلم قال کان الربوٰ الذی آذن اللہ فیہ بالحرب لمن لم یترکہ عند الجاھلیة علی وجھین کان یکون للرجل علی رجل حق الی اجل فاذا حل الاجل قال صاحب الحق أتقضی ام تربی ، فان قضاہ اخذ منہ والاطواہ الخ ۔ (٦)

ترجمہ : حضرت زیدؓ بن اسلم نے فرمایا وہ ربوٰ جس کے ترک نہ کرنے والوں کے لئے اللہ تعالی نے اعلان جنگ فرمایا عہد جاھلیت میں دو طرح کی تھی : اول یہ کہ ایک آدمی کا دوسرے کے ذمہ پر ایک متعین وقت تک کے لئے حق یعنی دین ھوتا پس وہ متعین وقت آتا تو صاحب حق اپنے مدیون سے کہتا ادائیگی کرتے ھو یا مزید بڑھاتے ھو چنانچہ اگر وہ ادا کرتا تو لے لیتا ورنہ تاخیر کے بدلے مزید بڑھاتا چلا جاتا ۔

حضرت مجاھدؒ ، حضرت قتادہؒ ، حضرت سعیدؒ بن جبیر اور حضرت عطاءؒ سے مروی اقوال حسب ذیل ھیں :

عن مجاھد انہ قال فی الربوٰ الذی نہی اللہ عنہ کان فی الجاھلیة

یکون للرجل علی الرجل دین فیقول لک کذا و کذا و تؤخر عنی فیؤخر عنه ۔ (۷) ۔۔

ترجمه : حضرت مجاهد نے کہا کہ وہ ربوٰ جس سے اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے عہد جاہلیت میں اس طرح تھی کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہوتا مقررہ وقت آنے پر مدیون دائن سے کہتا آپ کے لئے مزید یہ ہوگا مجھے مزید مہلت دے دیجیئے تو مزید مہلت دے کر ادائیگی کو مؤخر کر دیتا ۔

عن قتادۃؒ قال ان ربا الجاهلیة بیع الرجل البیع الی اجل مسمّی فاذا حل الاجل ولم یکن عند صاحبه قضاء زاده و اخر عنه (۸) ۔

ترجمه : حضرت قتادہ نے فرمایا ربائے جاہلیت کی شکل یہ تھی کہ شخص اپنی کوئی چیز دوسرے پر ایک خاص مدت تک ادھار بیچتا پھر جب وقت مقرر آتا اور مقروض کے پاس ادائیگی کا انتظام نہ ہوتا تو وہ دین کی رقم بڑھا کر ادائیگی مؤخر کر دیتا ۔

عن سعید بن جبیر قال ان الرجل کان یکون له علی الرجل المال فاذا حل الاجل طلبه من صاحبه فیقول المطلوب اَخّرِ عَنّی وازیدک فی مالک فیفعلان ذلک (۹) ۔

ترجمه : حضرت سعید بن جبیر نے رباء جاہلی کی شکل بیان کرتے ہوئے فرمایا ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ پر مال ہوتا جب ادائیگی کا وقت آتا تو وہ اپنے مدیون سے مطالبہ کرتا ادائیگی سے عاجز ہونے کیوجہ سے مدیون کہتا آپ مطالبہ مؤخر کر دیجیئے میں آپ کے مال کو زیادہ کر دیتا ہوں چنانچہ وہ دونوں ایسا کر لیتے ۔

عن عطاء قال : کانت ثقیف تداثن فی بنی المغیرة فی الجاهلیة فاذا حل الاجل قالوا نزیدکم و توخرون (۱۰) ۔

ترجمہ : مروی ہے کہ حضرت عطاء بن ابی رباح نے فرمایا کہ عہد جاہلیت میں بنو ثقیف بنو مغیرہ کو قرض دیا کرتے تھے جب ادائیگی کا مقررہ وقت آتا تو بنو مغیرہ ادائیگی سے قاصر ہوتے تو بنو ثقیف سے کہتے ہم دین کے مال کو بڑھا دیتے ہیں آپ ہمیں مزید مہلت دے دیجیئے ۔

ان مذکورہ آثار وروایات سے صاف واضح اور ظاہرہوتا ہے کہ عہد جاہلیت کی وہ ربوٰ جس کو قرآن مجید نے حرام ٹھہرایا اور اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایک شخص دوسرے کو ایک خاص مدت تک کے لئے نقد درہم و دینار کی شکل میں قرض دیتا یا اپنی کوئی شئے اس پر ادھار بیچتا پھر جب ادائیگی کا وقت مقرر آتا تو دائن اپنے مدیون سے ادائیگی کا مطالبہ کرتا چنانچہ اگر مدیون ادائیگی کر دیتا تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ورنہ مدیون ، دائن سے کہتا کہ میں دین کے مال میں اضافہ کئے دیتا ہوں آپ مجھے مزید اتنی مہلت دے دیجئے اس طرح یہ معاملہ مزید مہلت کے عوض مزید مال کی بنیاد پر چلتا رہتا اور بعض دفعہ بڑھتے بڑھتے دین کا اصل مال کئی گنا زیادہ ہو جاتا ، یعنی اضعافاً مضاعفةً ، اور چونکہ یہ ربوٰ کی بدترین اور زیادہ ظالمانہ شکل تھی لہذا قرآن مجید نے تحریم ربوٰ کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسی اضعافاً مضاعفةً والی شکل سے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ روکا ۔ سورۂ آل عمران کی آیت ہے

یآ ایہا الذین آمنوا لاتاکلوا الربوٰ اضعافاً مضاعفةً و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون واتقوا النار التی اعدت للکافرین (۱۱) ۔

ترجمہ : اے اہل ایمان نہ کھاؤ تم ربوٰ چند در چند اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے تاکہ تم فلاح و کامیابی پاؤ ، اور جہنم کی اس آگ سے بچنے کی کوشش کرو جو کافروں و منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

چونکہ قرآن کریم کی اس آیت میں صرف ربا کی اضعافاً مضاعفةً والی شکل کو حرام و ممنوع ٹھہرایا اور مسلمانوں کو عذاب کی وعید کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے ، لہذا اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ربوٰ کی بقیہ شکلیں جو اضعافاً مضاعفةً کا مصداق نہیں اور جن میں سود کی مقدار اصل سے کئی گنا نہ ہو حرام و ممنوع نہ ہونگی لیکن اس خیال کی جو مفہوم مخالف کی حیثیت رکھتا ہے بعض دوسری آیات قرآنی اور احادیث نبویہ سے نفی و تردید ہو جاتی ہے جو بقیہ شکلوں کی حرمت و ممانعت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ مفہوم مخالف کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جب اس کے خلاف دلائل و شواهد موجود نہ ہوں اور چونکہ یہاں موجود ہیں لہذا وہ قابل اعتبار اور لائق استدلال نہیں ، مطلب یہ کہ آیت مذکور سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ربوٰ کی اس شکل کے سوا جس کا اس میں ذکر ہے باقی شکلیں حرام و ناجائز نہیں بلکہ حلال و جائز ہیں جن میں سود کی مقدار کم مثلاً دس بیس فیصد ہو ، اصول استدلال کی رو سے درست نہیں ، واضح رہے کہ یہ بحث یہاں ضمناً آ گئی ہے ورنہ اصل مقصد اس آیت کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ربائے جاہلی کا تعلق صرف قرض و دین سے تھا اور اس زیادتی سے جو قرض و دین کے اصل مال پر بعوض مہلت و تاخیر کے طے ہوتی تھی ۔

روایات مذکورہ میں اگرچہ اس کا کوئی ذکر نہیں کہ جو

شخص دوسرے کو کچھ مدت کے لئے نقد قرض دیتا یا اپنی کوئی شئے دوسرے پر ادھار بیچتا پہلی مدت کے عوض بھی کچھ اضافہ کرتا تھا یا نہیں لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ پہلی مدت اور مہلت کے عوض بھی ضرور کچھ اضافہ کرتا ہوگا کیونکہ جو شخص بعد کی مہلتوں کے عوض اضافہ ضروری سمجھتا تھا وہ پہلی مہلت کو کیسے بغیر معاوضہ چھوڑ سکتا تھا ۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ جب قرآن مجید میں تحریم ربوٰ کی آیات نازل ہوئیں اسی طرح جب میدان عرفات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجة الوداع میں تحریم ربوٰ کے کلی خاتمے کا اعلان فرمایا تو سامعین فوراً سمجھ گئے کہ کس چیز کے خاتمے کا اعلان ہوا اور کس چیز سے روکا گیا ہے اور کسی کو یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ربوٰ کا کیا مطلب اور اس سے کیا مراد ہے اور نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ربوٰ کے معنی و مطلب کی وضاحت کی ضرورت محسوس فرمائی جو پہلے سے متعارف اور مروج چلی آ رہی تھی البتہ بعض دوسرے معاشی معاملات جو ربوٰ کے نام سے نہیں بلکہ دوسرے مختلف ناموں سے عرب معاشرے میں پائے جاتے اور ظلم و حق تلفی میں ربوٰ سے کچھ مشابہ تھے یعنی جس برائی کی وجہ سے ربوٰ کہہ کر ان سے منع فرمایا تھا وہ کسی حد تک ان کے اندر بھی بالفعل یا بالقوہ پائی جاتی تھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربوٰ کہہ کر ان سے منع فرمایا کیونکہ یہ چیز فرائض نبوت سے تعلق رکھتی تھی کہ حق و عدل کے جس تصور کی بنا پر کتاب اللہ میں بعض معاملات کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا گیا تھا ۔ رسول اللہؐ اسی

تصور کی بنا پر دوسرے ایسے معاملات کو حلال اور حرام قرار دیں جن کا کتاب اللہ میں ذکر نہ ہو لیکن معاشرے میں پائے جاتے ہوں۔ پھر آگے چل کر یہی چیز مجتہدین امت کا فریضہ قرار پاتی ہے کہ وہ اسی اصولی تصور کی روشنی میں ایسے معاملات کی شرعی حیثیتوں کا تعین کریں جو ان کے زمانہ میں نئے پیدا ہو گئے ہیں ، بلکہ ایسا کرنا اتباع سنت رسول کے تحت ضروری ہوگا ۔ بہرحال احادیث نبویہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فریضۂ منصبی کے تحت متعدد معاشی معاملات کو ربوٰ سے موسوم فرمایا جن کو اہل عرب ربوٰ نہیں سمجھتے تھے ، مثلاً چھ اشیاء : سونے چاندی ، گیہوں ، جو ، چھوہاروں اور نمک کے تبادلہ میں کمی و بیشی سے روکا اور اسے ربوٰ سے تعبیر فرمایا ، آگے چل کر فقہاء کرام نے اس ربوٰ کا نام ربا الفضل رکھا اور اس کو ربا النسیہ کے بالمقابل ایک مستقل قسم قرار دیا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر طول طویل بحثیں وجود میں آئیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں ۔

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے اہل عرب صرف قرض و دین کے اس معاملے کو ربوٰ سمجھتے اور کہتے تھے جس میں وقت کے عوض زیادتی کی شرط ہوتی تھی اور اس کا نام رباء النسیہ تھا اور ایک حدیث نبوی کے پیش نظر بعض صحابہ کرامؓ کا اصرار تھا کہ ربوٰ صرف رباء النسیہ ہے ،اس حدیث کے کلمات ہیں:

لا ربا الا فی النسیة ۔ ربا تو صرف نسیہ ھی میں ہے ، گویا وہ صحابہ کرام رباء الفضل کو حقیقی طور پر ربوٰ نہ سمجھتے اور اسے

اصلی معنوں میں ربٰو نہ مانتے تھے ۔ غالباً اسی وجہ سے بعض علماء نےرباء النسیہ کو رباء حقیقی اور رباء الفضل کو رباء مجازی کہا ہے، نیز ربا النسیۂ کو ربا القرآن اور رباء الفضل کو ربا الحدیث فرمایا ہے مطلب یہ کہ قرآن مجید میں جس ربو کا ذکر ہے وہ صرف ربا النسیہ ہے اور یہ کہ رباء الفضل کا ذکر صرف حدیث نبوی میں ہے۔

اسی طرح عرب کے اهل کتاب یہود و نصاری کے هاں ربٰو کے نام سے جو معاملہ متعارف تھا وہ یہی قرض و دین کا معاملہ تھا جس میں مہلت و تاخیر کے عوض زیادتی کی شرط ہوتی تھی ، اس کا بین ثبوت وہ متعدد عبارات ہیں جو آج بھی بائیبل یعنی تورات و انجیل میں موجود ہیں ، تورات کے سفر الخروج کی آیت ۲۵ ، سفر الاوّابین کی آیت ۳۵ و ۳۶ و ۳۷ ، سفر التثنیة کی آیت ۱۹ و ۲۰ ،، زبور داؤد کی آیت ۱۵ ، امثال سلیمان باب ۲۸ آیت ۸ ، کتاب نحمیاہ باب ۵ آیت ۷ و ۱۱ ، کتاب حزقیال باب ۱۸ ، آیت ۸ و ۱۳ و ۱۸ ، اسی طرح انجیل لوقا ٦ و ۳۴ و ۳۵ ، کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس ربٰو سے ان کو روکا اور منع کیا گیا تھا وہ یہی قرض و دین والی ربٰو تھی ، یہ الگ بات ہے کہ توریت کی ایک عبارت جس کا ترجمہ یہ ہے : ,, تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا ،، ۔ سے یہود نے یہ مطلب نکالا کہ یہ ممانعت صرف آپس میں یہودیوں کے لئے ہے یعنی یہودی اپنے یہودی بھائی کو سود پر قرض نہ دے لیکن غیر یہودی کو سود پر دے سکتا ہے چنانچہ ہمیشہ سے ان کا اسی پر عمل ہے ، قرآن مجید کی ایک آیت میں بھی مذمت کے پیرائے میں یہ بیان ہے کہ یہود کو ان کی کتاب میں ربا سے منع کیا گیا تھا لیکن وہ اس کے

کھانے اور لینے سے باز نہ آئے اور چونکہ وہ عموماً غیر یہودیوں سے ربوٰ لیتے تھے لہذا اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہود کے لئے ربا کی جو ممانعت تھی وہ یہودی اور غیر یہودی دونوں سے متعلق تھی اور ان کی وہ تاویل غلط ہے جس کی بنا پر انہوں نے اس ممانعت کو صرف یہودی سے مختص کیا ۔

پھر اس بات کا ثبوت کہ قرآن مجید نے اسی ربوٰ کو حرام و ممنوع ٹھہرایا ہے جو اس وقت عربوں میں متعارف چلی آ رہی تھی خود قرآن مجید کی ایک آیت سے فراہم ہوتا ہے جس میں سود خواروں کے ایک جملے کو نقل کرکے اس کی تردید کی گئی ہے ، وہ جملہ یہ کہ ,, انما البیع مثل الربوٰ ،، ۔ سوائے اس کے نہیں کہ بیع ربوٰ کی مانند ہے اور اس کی تردید میں فرمایا گیا ہے ,, واحل اللہ البیع وحرم الربوٰ ،، ۔ اور اللہ نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام ٹھہرایا ہے ، اور چونکہ حلال چیز اور حرام چیز ایک دوسرے کے مثل و مانند نہیں ہوتی لہذا بیع اور ربوٰ بھی ایک دوسرے کے مثل و مانند نہیں اور پھر یہ ظاہر ہے کہ مذکورہ تردید صرف اسی صورت میں قابل اعتبار اور قرین صحت ہو سکتی ہے جب آیت مذکور کے دوسرے ٹکڑے : ,, واحل اللہ البیع وحرم الربوٰ ،، ۔ میں ربوٰ کا معنی و مطلب وہی ہو جو اس کے پہلے ٹکڑے ,, انما البیع مثل الربوٰ ،، میں ربوٰ کا تھا ورنہ تردید نہیں ہو سکتی ، اور چونکہ آیت کے پہلے حصہ میں ربوٰ کا معنی و مطلب ، سود خواروں کے ذہنوں میں وہی تھا جو اس وقت عام طور پر متعارف اور جانا پہچانا تھا یعنی قرض و دین کے اصل مال میں مہلت کے عوض زیادتی ، لہذا آیت کے دوسرے حصہ

میں بھی لامحالہ ربوٰ کا وھی معنی و مطلب ہے اور اسی کو حرام قرار دیا گیا ہے جو عہد جاھلیت میں متعارف تھا ، اس کا صاف مطلب یہ ھوا کہ قرآن کریم کی حد تک ربوٰ کا شرعی معنی و مفہوم ٹھیک وھی ہے جو اس کا عرفی معنی و مفہوم تھا ، اسی طرح بعض احادیث نبویہ سے بھی اسی کی تائید و توثیق ھوتی ہے مثلاً ایک وہ حدیث جو حضرت اسامہ بن زیدؓ سے بایں الفاظ مروی ہے اور صحیح البخاری اور صحیح المسلم وغیرہ میں مذکور ہے : ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انما الربوٰ فی النسیۃ ـ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوائے اس کے نہیں کہ ربوٰ صرف نسیہ اور ادھار میں ہے ـ

دوسری وہ حدیث جو خطبۂ حجۃ الوداع سے تعلق رکھتی ہے اور جس کے ربوٰ سے متعلق کلمات اس طرح ھیں :

الا وان ربوٰ الجاھلیۃ کلہ موضوع و اول ربو اضعہ ربانا ربوٰ العباس بن عبدالمطلب ـ

آگاہ رھو کہ عہد جاھلیت کی ھر ربوٰ مٹا دی اور ختم کر دی گئی اور پہلی ربوٰ جسے میں ملیا میٹ کرتا ھوں ھماری ربوٰ میں سے چچا عباس بن مطلب کی ربوٰ ہے اور چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ربوٰ قطعی طور پر قرض و دین سے متعلق تھی ، لہذا اس حدیث میں اسی کی ممانعت کا ذکر ہے اور وھی ربا الجاھلی ہے ـ

تیسری وہ حدیث جس میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاھدہ کا ذکر ہے معاھدے کی دفعات میں سے ایک دفعہ یہ ہے کہ وہ ربوٰ کا لین دین نہیں کریں گے ، یہ ربوٰ بھی قطعی طور پر قرض میں زیادتی والی ربوٰ تھی ـ

چوتھی حدیث وہ بھی ہو سکتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے :

عن علی رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کل قرض جر منفعة فھو ربوٰ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر قرض جو منفعت کھینچے پس وہ ربوٰ ہے۔

متعدد آثار صحابہ جن میں عبداللہ بن مسعود ، عبداللہ بن عمر، ابی بن کعب ، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم شامل ہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرض سے کوئی مادی فائدہ اٹھانے کو ربوٰ اور ناجائز سمجھتے اور اس سے روکتے تھے ، ایسے آثار امام بیہقی کی سنن الکبریٰ اور حافظ عبدالرزاق کی مصنف عبدالرزاق وغیرہ میں مذکور ہیں ۔

ربائے حقیقی اور ربائے جلی کا تعلق قرض و دین سے ہے اس کا اظہار فقہاء کرام کی مندرج ذیل تعریفات سے بھی بخوبی ہوتا ہے جو ربوٰ سے متعلق انہوں نے لکھی ہیں :

الربوٰ : ,, الزیادة فی الدین سواء کان دین نقود ام دین طعام و سلعة فی مقابل الاجل ،، ۔ مہلت کے بالمقابل قرض میں زیادتی خواہ وہ قرض زر و نقدی کا ہو یا کسی جنس وغیرہ کی خرید و فروخت کا ، (۲) ,, کل ما جاوز رأس المال فی الدین ،، ۔ قرض کے اصل مال پر جو بھی متجاوز اور زائد ہو ربوٰ ہے۔ (۳) ,, ای الزائد فی القرض والسلف علی قدر المدفوع ،، ۔ قرض میں دیئے ہوئے مال کی اصل مقدار پر جو بھی زائد ہو ربوٰ ہے۔ (۴) ,, الزیادة المشروطة فی

الدین بدون مقابل »۔ قرض میں بغیر کسی حقیقی بدل کے جو بھی زیادتی مشروط ہو ربو ہے۔ ان چاروں تعریفوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ربوٰ کا تعلق اس مال سے ہے جو کسی کے ذمے واجب الاداء ہو اور اس کی حقیقت وہ زیادتی ہے جو مہلت اور میعاد کے عوض اس شخص سے لی جاتی ہے جس کے ذمے قرض واجب الاداء ہوتا ہے۔

جنہاں تک الربح کی شرعی حقیقت کا تعلق ہے قرآن مجید کی ایک آیت :"فما ربحت تجارتھم"اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت احادیث میں چونکہ اس کا استعمال تجارتی نفع کے لئے ہوا ہے۔ لہـذا اس میں کوئی شک و شبہ اور کوئی اختلاف نہیں کہ ربح کی شرعی حقیقت کا تعلق بھی اختصاصی طور پر بیع و شراء اور تجارت کے معاملہ سے ہے اور وہ شرعی طور پر صرف اس زیادتی مال کا نام ہے جو تاجر کی دماغی جسمانی محنت و مشقت اور تگ و دو کے ذریعے وجود میں آتی ہے یعنی جس کے بالمقابل تاجر کی سعی و کوشش اور جدوجہد موجود ہوتی اور جو رأس المال میں اضافے کا موجب بنتی ہے۔

گذشتہ صفحات میں ربوٰ اور ربح کی حقیقت و ماہیت سے متعلق کافی تفصیل کے ساتھ جو کچھ پیش کیا گیا ہے میں سمجھتا ہوں اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ربوٰ کیا ہے اور ربح کیا ؟ اور مال میں کونسی زیادتی ربوٰ کا مصداق اور کونسی زیادتی ربح کا مصداق ہے ؟

ربوٰ اور ربح کے متعلق مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اگر ہم سرمایہ کاری کی ان مروجہ شکلوں کا جائزہ لیں جو ہمارے معاشرہ

میں پائی جاتی ھیں تو ھم بخوبی سمجھ سکتے ھیں کہ ربوٰ اور ربح کے نقطہ نظر سے ان میں سے کونسی شکلیں شرعاً جائز اور کونسی ناجائز ھیں اور ان کے ذریعے کونسی کمائی حلال اور کونسی حرام ہے۔

بہرحال سرمایہ کاری کی جو شکلیں ایسی ھیں کہ ان میں ایک فریق کا مال دوسرے کے پاس بطور قرض واجب الاداء ھوتا اور وہ وقت اور مہلت کے عوض اصل مال پر کچھ زائد کا حقدار قرار پاتا ہے وہ شرعاً ناجائز کے تحت آتی اور ان میں حاصل ھونے والا زائد مال ، مذکورہ تفصیل کے مطابق یقیناً ربوٰ کا مصداق ٹھہرتا ہے اور اسے ربح و نفع کہنا کسی طرح صحیح نہیں ھو سکتا ، مثلاً بنکاری کی مروجہ شکل جس میں کھاتہ داروں کا مال بنک کے پاس اور بنک کا مال کاروباری لوگوں کے پاس بطور واجب الاداء قرض ھوتا اور وقت و مہلت کے عوض کھاتہ دار بنک سے اور بنک اپنے مقروض لوگوں سے اصل پر مزید مال کا حقدار ٹھہرتا ہے ، اس شکل کے اندر کھاتہ دار بنک سے اور بنک اپنے قرض داروں سے اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اسے ربح ، نفع اور پرافٹ سمجھنا اور کہنا قطعاً غلط ھوتا اور وہ سو فیصد ربوٰ کی تعریف میں آتا اور سود بیاج اور انٹرسٹ کا مصداق قرار پاتا ہے۔

ربو اور ربح کا شرعی حکم یہ کہ ربوٰ حرام و ناجائز اور ربح حلال و جائز ہے ، قرآن و حدیث کی جن نصوص سے ربوٰ کا حرام و ناجائز ھونا اور ربح کا حلال و جائز ھونا ثابت اور واضح ھوتا ہے ان میں سے کچھ یہ ھیں : ربوٰ کے متعلق قرآنی آیات جو اس کے حرام و ممنوع ھونے پر دلالت کرتی ھیں :

اول یہ کہ ,, و احل اللہ البیع و حرم الربوٰ (۱۲)» ۔ اور اللہ تعالی نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام ٹھہرایا ۔

دوم یہ کہ ,, ومن عاد فأولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون (۱۳) ۔ جو منع کرنے کے باوجود اس کا لین دین جاری رکھیں گے وہ جہنم کی آگ والے ھیں اور اس میں ھمیشہ ھمیشہ رھیں گے ۔

سوم : فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (۱۴) ۔ پس اگر تم ربوٰ کو ترک نہیں کرتے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ھو جاؤ ، گویا اللہ اور رسول کے ساتھ مصروف جنگ ھو ۔

چہارم : ,, واتقوا النار التی اعدت للکافرین (۱۵) » ۔ (ربوٰ نہ کھاؤ) اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۔

پہلی آیت میں واضح طور پر بیع کے حلال اور ربوٰ کے حرام ھونے کی تصریح ہے اور دوسری ، تیسری اور چوتھی آیات میں ربوٰ خواروں کے لئے عذاب کی جو وعید اور دھمکی ہے وہ ربا کے حرام ھونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ عذاب کی وعید فعل حرام کے ارتکاب پر ھی ھوتی ہے ۔

اس بارے میں احادیث نبویہ کثیر التعداد ھیں ان میں سے چند کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

۱ ۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سات کبیرہ گناھوں سے اجتناب کرو جو انسان کو ھلاک کر دینے والے ھیں ۔ اول اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ، دوم ناحق کسی کو قتل کرنا ، اور سوم ربوٰ کھانا اور سود لینا ، گویا ربا خوری ، شرک اور قتل ناحق جیسا بدترین جرم اور سنگین گناہ ہے ۔

۲ ۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ربوٰ کھانے والے ، ربوٰ کھلانے والے ، ربوٰ کی دستاویز لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے پر۔

۳ ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ربوٰ کے تہتر درجے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ درجے کی برائی ایسی ہے جیسے ماں سے زنا کرنا ۔

۴ ۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ربوٰ کا ایک درہم لینا گناہ میں ایسا ہے بلکہ اس سے بڑھا ہوا جیسے تینتیس مرتبہ زنا کرنا ۔

معاملہ ربوٰ کے بالمقابل معاملہ بیع کو قرآن مجید کی آیت مذکورہ میں حلال و جائز بتلایا گیا ہے احل اللہ البیع . اسی طرح بعض دوسری آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیع و شراء اور تجارت کا معاشی مشغلہ مومن اور نیک بندوں کا مشغلہ ہے جیسے سورۃ النور کی یہ آیت:

رجال لاتلهيهم تجارة و لا بيع عن ذكر الله واقام الصلوة الآية (١٦) ۔

وہ ایسے نیک لوگ ہیں جن کو اللہ کی یاد اور نماز سے نہ بیع و شراء غافل بناتی ہے اور نہ تجارت ۔

اور سورۃ الجمعة کی یہ آیت :

يا ايها الذين آمنوا اذا نودی للصلوٰة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكر الله وذروا البيع (١٧) ۔

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز جمعہ کی اذان ہو تو ذکر اللہ کی طرف چل پڑو اور بیع و شراء کے کام کو چھوڑ دو ۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بیع و شراء اور تجارت کا مشغلہ حلال اور مشروع مشغلہ ہے پھر چونکہ اس مشغلہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اختیار فرمایا لہذا اس سے اس مشغلہ کا بہتر اور افضل مشغلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ سب سے بہتر اور پاکیزہ کمائی اور روزی وہ ہے جو خود آدمی اپنے ہاتھ کی محنت و مشقت اور صاف ستھری تجارت کے ذریعے کماتا اور حاصل کرتا ہے۔ ایک اور حدیث نبوی کا مضمون ہے صداقت شعار اور دیانتدار تاجر قیامت کے دن انبیاء ، شہداء اور صدیقین کے ساتھ ہوگا۔

اور چونکہ ربح اس نفع کا نام ہے جو تجارت اور خرید و فروخت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے لہذا جو قرآنی آیات اور احادیث نبویۂ ، تجارت اور خرید و فروخت کے حلال و مشروع ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہی ربح کے حلال اور جائز ہونے پر بھی دلالت کرتی ہیں۔

مذکورہ آیات اور احادیث سے صریح اور قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ربوٰ حرام و ناجائز اور ربح حلال اور جائز ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو ربوٰ سے بچنے اور ربح کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں یہ مضمون ناقص و نامکمل رہے گا اگر اس فلسفے کو واضح نہ کیا جائے جس کے تحت شریعت اسلام نے ربوٰ کو حرام اور ربح کو حلال قرار دیا ہے ، یعنی جب تک یہ واضح نہ کیا جائے کہ اسلام نے ربوٰ کو کیوں حرام اور ربح کو کیوں حلال ٹھہرایا ہے ؟ اس بارے میں اپنے علم و فہم کے مطابق میرا جواب یہ ہے :

قرآن حکیم کی بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی نظام ہدایت میں اس چیز کو بطور ایک اعلیٰ مقصد کے سامنے رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک ایسا انسانی معاشرہ قائم ہو جس کے ہر ہر پہلو اور تمام شعبوں میں کامل عدل و انصاف پایا جاتا ہو یعنی جس کے اندر ہر ہر فرد کے ہر قسم کے حقوق ٹھیک ٹھیک محفوظ ہوں اور یہ غالباً اس لئے کہ دراصل ایک ایسے ہی عادلانہ معاشرے میں ہر فرد کو پائیدار امن و اطمینان کی وہ خوشگوار اور ترقی پذیر زندگی نصیب ہو سکتی ہے جس کی ہر انسان کے اندر پیدائشی اور اضطراری طور پر طلب و خواہش پائی جاتی اور جس کے حصول کے لئے ہر انسان ہمیشہ مصروف جدوجہد رہتا ہے، اسی طرح ایک ایسے ہی عادلانہ معاشرے میں افراد کی ان خلافتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے اور بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے جو اشیاء کائنات کی تسخیر اور ان سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے انہیں ودیعت کی گئی ہیں۔

غرضیکہ عدل اجتماعی کی اسلامی نظام حیات میں بنیادی اھمیت اور مرکزی حیثیت ہے اور اسلام کی جملہ تعلیمات کا اس سے بڑا گہرا اور مضبوط تعلق ہے ایمانی عقائد سے متعلق تعلیمات ہوں یا عبادات اور اخلاقی فضائل سے متعلق تعلیمات، معاشرت سے متعلق تعلیمات ہوں یا معیشت و اقتصاد سے متعلق تعلیمات، سیاست سے متعلق تعلیمات ہوں یا تہذیب و ثقافت سے متعلق تعلیمات سب کے اندر عدل و قسط کو پوری طرح ملحوظ و مدنظر رکھا گیا ہے۔ لیقوم الناس بالقسط . چنانچہ جو معاشی معاملات عدل و قسط کے

مطابق تھے اور جن میں ہـر فریق کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا ملتا تھا اسـلام نے ان کو حـلال و جـائز ٹھہرایا ، اور جـو اس کے برخلاف ایسے معاشی معاملات تھے جن میں ایک فـریق کی ضرور حق تلفی واقع ہوتی اور اسے ضـرور نقصان پہنچتا تھا اسـلام نے ان کو حـرام و باطل قرار دیا اور ان سے منع فـرمایا ـ

معـاملۂ بیع و شـراء اور خـرید و فـروخت اپنی اصل حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے چونکہ ایک ایسا معاشی معاملہ تھا جس میں ہر فریق کو اس کا حـق ملتا اور وہ اپنی چیز کا عـوض پاتا تھا۔ بائع یعنی بیچنے والے کـو اپنی شئے کے عـوض نقـد وغیرہ کی شکل میں قیمت ملتی اور مشتری یعنی خـریدنے والے کو اپنے مال کے عـوض جنس و سامان کی شکل میں کوئی شئے ملتی اور ہر ایک اپنا حق پاتا تھا ـ یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ ماپ تول میں کمی بیشی ، جھوٹ و کذب بیانی اور دھوکے و فریب کی وجہ سے ایک فریق کو اس کا پورا حق نہیں ملتا اور وہ نقصان کا شکار ہو جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز اس معاملہ کی ماہیت میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہے جس طرح کہ سچائی اور دیانتداری اس کا جزء لازم نہیں ورنہ اسـلام تجارت اور خرید و فـروخت کے کام میں دھوکے فریب اور خیانت و جھوٹ سے کیوں روکتا اور اس تجارت کو جس میں ایک فـریق کی حقیقی رضامندی کی بجائے مجبوری شامل ہو باطـل و ناجائز کیوں کہتا اور صحت تجارت کے لئے فریقیـن کی شعـوری رضامندی کو ضروری کیوں قرار دیتا ، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ نفس معاملہ کی حد تک اس میں ہر فریق کو اس کا حق ملتا ہے تاجـر اپنی

قیمت خرید پر خریدار سے جو زائد لیتا ہے اور جو نفع کماتا ہے اس کے عوض اس کی طرف سے چونکہ دماغی و جسمانی محنت و مشقت موجود ہوتی ہے ، لہذا اس کی وجہ سے وہ زائد کا حقدار ٹھہرتا ہے کیونکہ انسانی محنت پیدائش دولت کا مسلمہ اور متفقہ سبب ہے اور پھر یہی وجہ ہے کہ خریدار یہ جانتے ہوئے کہ تاجر نے جتنی قیمت سے یہ چیز خریدی ہے اس سے زیادہ میں بیچ رہا ہے رضا و خوشی سے زیادہ دے دیتا ہے اور زائد کو اس کی محنت و مشقت کا عوض اور بدل باور کرتا اور اس کا حق سمجھتا ہے ، دراصل تاجر کی دماغی محنت وہ ہوتی ہے جو وہ سامان تجارت خریدنے سے پہلے سوچتا اور غوروفکر کرتا ہے کہ کیا چیز کہاں سے کس وقت خریدے اور پھر کب اور کہاں فروخت کرے تاکہ اسے یقینی نفع ہو اور نقصان نہ اٹھانا پڑے ، اور اس کی جسمانی محنت و مشقت وہ ہوتی ہے جو وہ ادھر ادھر جانے، سامان تجارت خریدنے، قبضہ کرنے ، ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے ، اس کی حفاظت کرنے اور پھر ماپ تول کر بیچنے میں صرف کرتا اور تکلیف اٹھاتا ہے چنانچہ یہ دماغی جسمانی محنت و مشقت اسے ربح و نفع کا حقدار بنا دیتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ربح و نفع کی مقدار کتنی ہوتی چاہیئے اور کتنی نہیں ہوتی چاہیئے تو اسلام کے نزدیک اس کا معیار عام عرف اور رواج ہے چنانچہ اگر ربح و نفع اس کے مطابق ہو تو جائز ورنہ ناجائز ہے اور یہ اس لئے کہ جو چیز عام عرف و رواج کے مطابق ہو انسان اسے بخوشی قبول کر لیتا اور جو عام عرف و رواج کے مخالف ہو اسے خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ مجبوری کے تحت بادل نخواستہ قبول کرتا ہے ، عدل کے مطابق ایک معیار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

تاجر اگر خریدار کی جگہ اور خریدار تاجر کی جگہ ہوتا تو اس صورت میں تاجر خریدار کو جس قدر نفع دینے پر رضامند ہوتا اسی قدر دوسری صورت میں وہ خود بھی خریدار سے لے سکتا ہے اور پھر چونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ ایک تاجر جب فروخت کرنے کے ارادہ سے کوئی شئے دوسرے سے خریدتا ہے تو اس کی یہی مرضی اور خواہش ہوتی ہے کہ اسے وہ شئے اسی نرخ اور قیمت پر ملے جو بازار اور منڈی میں عام طور پر رائج اور معروف نرخ اور قیمت ہے لہذا عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے خریدار سے بھی اتنی ہی قیمت لے جو عام رواج اور عرف کے مطابق ہو چنانچہ اگر وہ دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منہگا بیچتا اور زیادہ قیمت لیتا ہے تو حق تلفی کا مرتکب ہوتا اور باطل طریقہ سے دوسرے کا مال کھاتا ہے جو حرام و ناجائز ہے۔

ادھر اسلام چونکہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرہ اپنی ضرورت کے مطابق اشیاء ضرورت پیدا کرے اور طلب و رسد میں ہمیشہ توازن برقرار رہے ، لہذا طلب و رسد میں مصنوعی عدم توازن اور کمی بیشی کے تحت وہ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور حکومت پر لازم ٹھہراتا ہے کہ وہ توازن قائم کرنے اور رکھنے کے لئے جبر و سختی سے کام لے اور طاقت استعمال کرے۔

خلاصہ یہ کہ معاملۂ بیع و شراء میں چونکہ ہر فریق کو اس کا حق ملتا اور وہ عدل کے مطابق تھا ، لہذا اسلام نے اسے حلال اور جائز قرار دیا نیز وہ معاشرے کے قیام و بقا کے لئے ضروری تھا کیونکہ کوئی متمدن معاشرہ بیع و شراء اور تجارتی تبادلے اور لین دین

کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ، لہذا اسلام نے اسے مشروع اور ضروری ٹھہرایا ۔

اس کے مقابلہ میں ربوٰ کا معاملہ چونکہ اپنی اصل ماہیت اور بنیادی ساخت کے لحاظ سے ایسا معاملہ تھا جس میں ایک فریق کی ضرور حق تلفی واقع ہوتی اور اسے لازماً نقصان پہنچتا تھا گویا تلفی اور ظلم کا عنصر اس کی ماہیت کا ایک جزو لاینفک اور لازمی حصہ تھا ، لہذا اسلام نے اسے قطعی طور پر حرام اور باطل قرار دیا ۔

ربوٰ کے معاملہ میں ایک فریق کی کیسے حق تلفی ہوتی ہے اس کی وضاحت یہ کہ اس معاملہ میں۔مقرض و دائن کے لئے قرض و دین کی اصل رقم پر جو زائد طے پاتا ہے وہ شرعاً اس کا حق نہیں بلکہ اس مقروض و مدیون کا حق ہوتا ہے جو وہ زائد ادا کرتا ہے کیونکہ شریعت اسلامی کی رو سے کوئی شخص دوسرے کے مال کا صرف اس صورت میں حقدار ٹھہرتا ہے جب اس کی طرف سے اس مال کا کوئی حقیقی عوض اور بدل موجود ہو خواہ وہ عوض کسی مادی مال کی شکل میں ہو یا مفید محنت اور خدمت کی شکل میں ہو یا نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری کی شکل میں ہو ، اور چونکہ معاملہ ربوٰ میں اس زائد مال کے عوض جو سود خوار اپنے مقروض سے بطور سود لیتا ہے مذکورہ چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی لہذا وہ شرعاً اس زائد مال کا حقدار نہیں ٹھہرتا اور لیتا ہے تو دوسرے کا حق لیتا ہے جس کا نام ظلم ہے ، جہاں تک اس مہلت اور مدت کا تعلق ہے جو قرض خواہ اپنے قرض دار کو ادائیگی قرض

کے لئے دیتا ہے۔اسلام اس کو ہرگز کسی مال کا عوض اور بدل تسلیم نہیں کرتا اور اس کی بنا پر قرض خواہ کو کسی زائد مال کا حقدار نہیں ٹھہراتا ، حالانکہ سود خوار اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے وہ اس مہلت اور میعاد کے عوض لیتا ہے جو وہ اپنے مقروض کو دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے کاروباری لین دین کے ایسے مال کو اکل بالباطل سے تعبیر فرمایا اور اس سے مسلمانوں کو روکا ہے جس کا کوئی عوض و مقابل نہ ہو ، سورۃ النساء کی آیت ہے :

یا ایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم (۱۸) ۔

ترجمہ : اے ایمان والو تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ سوائے اس کے کہ وہ تجارت کا طریقہ ہو اور باھمی رضامندی سے ۔

اس آیت مبارکہ میں جس اکل بالباطل سے منع کیا گیا ہے مفسرین کرام نے اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصریؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کے معنی و مطلب کی وضاحت ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ : الباطل ھو کل ما یؤخذ من الانسان بغیر عوض ۔ باطل ہر وہ مال ہے جو انسان سے بغیر عوض کے لیا جائے ۔

تفسیر المنار میں علامہ رشید رضا نے باطل کی تفسیر میں لکھا ہے:

,, اما الباطل مالم یکن فی مقابلۃ شئی حقیقی ،، ۔ ترجمہ ۔ پس باطل وہ مال ہے جو کسی حقیقی شئی کے مقابلہ میں نہ ہو ، پھر لکھا ہے کہ

سرقہ ، جوا ، رشوت ، ربوٰ ، خیانت سب باطل کی تعریف میں آتے ہیں اس لئے کہ ان میں ایک شخص دوسرے کا مال بغیر عوض اور بلاحق لیتا ہے۔

معاملہ ربوٰ میں ربا خور اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے وہ بلا عوض ہوتا ہے اس کا اظہار بعض محقق علماء و فقہاء کی حسب ذیل تحریرات سے بخوبی ہوتا ہے احکام القرآن میں علامہ الجصاص کی تحریر ہے :

ان تلک الزیادۃ المشروطۃ انما کانت ربا فی المال العین لانہ لاعوض لہا من جہۃ المقرض (۱۹) ۔

قرض کے حقیقی مال میں یہ مشروط زیادتی اِس لئے ربوٰ ہے کہ مُقرِض کی جانب سے اس کا کوئی عوض اور بدل نہیں ہوتا ۔

علامہ ابوبکر بن العربی اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں :

والمراد بربو فی الآیۃ کل زیادۃ لم یقابلہا عوض ۔ ربوٰ سے مراد ہر وہ زیادتی ہے جس کے بالمقابل کوئی عوض نہ ہو۔ص ۱۰۲ ، ج ۱

علامہ رشید رضا تفسیر المنار میں آیات ربوٰ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وہناک وجہ آخر وہو ان اللہ تعالی جعل طریق تعامل الناس فی معائیشہم ان یکون استفادۃ کل واحد من الآخر بعمل ، ولم یجعل لاحد منہم حقا علی آخر بغیر عمل لانہ باطل لامقابل لہ ، وبہذہ السنۃ احل اللہ البیع لان فیہ عوضا یقابل عوضا ، وحرم الربوٰ لانہ لامقابل لہا (۲۰) ۔

”یہاں بیع کے حلال اور ربوٰ کے حرام ہونے کی ایک وجہ اور بھی

ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے لوگوں کے درمیان معاشی امور و معاملات کا یہ طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ ہر ایک دوسرے سے عمل کے ذریعے فائدہ اٹھائے اور بغیر عمل کے کسی کے لئے دوسرے پر کوئی حق نہیں ٹھہرایا کیونکہ وہ باطل ہے جس کا کوئی عوض نہیں اور پھر اسی قاعدے کے تحت اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا کیونکہ اس میں ہر عوض کے بالمقابل عوض ہے اور ربوٰ کو حرام ٹھہرایا کیونکہ اس کا کوئی مقابل اور بدل نہیں۔"

اسی قسم کی ایک تحریر علامہ سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن میں اس طرح ہے:

فالمال لایربح الا بالجهد والجهد هو المعول علیه فی الاسلام لذلک یحرم الربوٰ فی جمیع الاحوال (۲۱)۔

پس مال نہیں بڑھتا مگر جہد و عمل سے اور جہد و محنت ہی وہ حقیقی چیز ہے جو اسلام میں قابل اعتماد ہے اسی وجہ سے اسلام نے ربوٰ کو تمام صورتوں میں حرام ٹھہرایا ہے۔

پیچھے ربوٰ کی جو تعریفیں ذکر کی گئی ہیں ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ربوٰ میں ایک فریق دوسرے کا مال بغیر عوض کے لیتا ہے جیسے "الربوٰ ای فضل خال عن العوض والمقابل" اور "الزیادة المشروطة فی الدین بدون مقابل"۔

یہاں اگر یہ کہا جائے کہ کسی چیز سے فائدہ اٹھانا بھی تو ایک شئے ہے جو مال کا عوض بن سکتی ہے، آخر اسلام میں اجارے کا جو جواز ہے تو اس میں سوائے اس کے کیا ہوتا ہے کہ ایک فریق اپنی کوئی شئے دوسرے کو فائدہ اٹھانے کے لئے دیتا اور اس فائدے کے

عوض دوسرے سے نقد وغیرہ کی شکل میں کرایہ لیتا ہے ، اور چونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرض کے مال سے مقروض شخص فائدہ اٹھاتا ہے اگر اسے اپنی کسی نجی و ذاتی ضرورت پر خرچ کرتا ہے مثلاً خوراک ، لباس ، مکان ، علاج ، تعلیم اور شادی پر ، تو یہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ کوئی کاروبار کرکے کماتا ہے تو یہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ، لہذا مقرض اپنے مقروض سے بطور سود جو زائد لیتا ہے اسے کیوں نہ اس فائدے کا عوض سمجھا جائے جو مقروض نے قرض کے مال سے اٹھایا اور اسے کیوں نہ کرائے کی طرح جائز سمجھا جائے ؟

اس کا جواب یہ کہ اسلام بلاشبہ معاملہ اجارہ کو جائز قرار دیتا ہے لیکن چونکہ ربٰو کا معاملہ بنیادی طور پر اجارہ کے معاملہ سے مختلف ہے ، لہذا اس کو اجارہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اسلام میں صرف اس چیز کو اجارہ پر دینا اور اس کا کرایہ وصول کرنا جائز ہوتا ہے جو استعمال ہونے اور فائدہ اٹھانے سے مالیت اور قیمت میں گھٹتی اور کم ہوتی چلی جاتی ہے ۔ بالفاظ دیگر اسلام کے نزدیک صرف ایسی اشیاء کا اجارہ جائز ہے جو استعمال ہونے سے گھستی ، تحلیل ہوتی اور اپنی قدر و قیمت بتدریج کھوتی چلی جاتی ہیں ، چنانچہ معاملہ ختم ہونے پر جب مالک کی طرف لوٹتی ہیں تو نارمل حالات میں ان کی وہ مالیت اور قدروقیمت نہیں رہتی جو معاملہ شروع ہوتے وقت اور استعمال ہونے سے پہلے تھی ، اور اس کو اسلام نے اس وجہ سے جائز قرار دیا ہے کہ اس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا عوض و بدل موجود ہوتا ہے اور کوئی کسی کامال بغیر

عوض کے نہیں لیتا ، اجارے کی چیز کا مالک جو اجرت و کرایہ لیتا ہے اس کے عوض وہ مالی نقصان ہوتا ہے جو کرایہ دار کے استعمال سے اس کی چیز میں واقع ہوتا ہے اور کرایہ دار جو کرایہ دیتا ہے اس کے عوض مالک کا نقصان ہوتا ہے جو اس کے فائدہ اٹھانے سے وجود میں آتا ہے، البتہ جو شئے استعمال ہونے سے مالیت و قیمت میں گھٹتی نہ ہو بلکہ ہر حال میں اس کی قیمت ایک سی رہتی ہو تو اسلام ایسی شئے کے اجارے کو جائز نہیں ٹھہراتا کیونکہ استعمال ہونے کے بعد جب مالک کی طرف لوٹتی ہے تو عام حالات میں اس کی مالیت اور قیمت وہی رہتی ہے جو استعمال سے پہلے تھی، لہٰذا ایسی شئے کے استعمال پر اس کا مالک استعمال کرنے والے سے جو معاوضہ لیتا ہے وہ بلاعوض ہوتا ہے جو باطل و ناجائز ہے، اور چونکہ معاملہ ربوٰ میں ایسا ہی ہوتا ہے یعنی وقت مقرر کے بعد مقرض قرض کا اصل مال بھی پورے کا پورا مع اضافے کے مقروض سے لیتا ہے جس کا اس کی طرف سے کوئی عوض موجود نہیں ہوتا ، دوسرا نمایاں فرق معاملہ ربوٰ اور معاملہ اجارہ کے مابین یہ ہے کہ معاملہ ربوٰ میں ایک کا مال دوسرے کے پاس بطور قرض ہوتا جبکہ اجارہ میں ایک کا مال دوسرے کے پاس بطور عاریت ہوتا ہے چنانچہ قرض کا مال ضائع ہو جائے تو اس کا تمام تر ذمہ دار مقروض ہوتا ہے قرض خواہ نہیں ہوتا اس لئے کہ قرض میں مال قرض ، قرض خواہ کی ملکیت سے قرضدار کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے جبکہ اجارے میں اجارے کی شئے اگر کسی ارضی سماوی آفت سے تلف ہو جائے تو اس کا تمام تر نقصان مالک کو اٹھانا پڑتا ہے اس لئے کہ اصلاً وہ

شئے اسی کی ملکیت میں رہتی ہے کرایہ دار کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتی بلکہ اس کے پاس بطور عاریت ہوتی ہے، یہ ہیں وہ وجوہ جن کی بنا پر معاملہ ربوٰ کو معاملہ اجارہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، لہذا جو لوگ سود کو مال کا کرایہ سمجھتے ہیں وہ اسلام کی رو سے صریح غلطی پر ہیں۔

اسی طرح معاملۂ ربوٰ کو معاملہ مضاربت پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بحث اجارہ میں بیان کی گئی یعنی عامل مضارب کے پاس دوسرے کا جو مال بغرض تجارت ہوتا ہے وہ عامل مضارب کے پاس بطور قرض نہیں بلکہ بطور امانت ہوتا ہے چنانچہ اگر کسی غیر اختیاری سبب سے وہ تلف اور ضائع ہو جائے تو اس کا ضمان اور تاوان عامل مضارب پر نہیں آتا۔ بلکہ وہ تمام تر رب المال کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور چونکہ بعض دفعہ ایسا ہو جاتا اور اس کا احتمال تو ہمیشہ رہتا ہے، لہذا اس کی وجہ سے رب المال کے لئے نفع کی صورت میں نفع کے ایک مقررہ نسبتی حصہ کا جواز پیدا ہو جاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل معاملہ ربوٰ میں ایک کا جو مال دوسریکے پاس ہوتا ہے وہ بطور قرض ہوتا ہے جس کی مثل کی ادائیگی مقروض پر واجب الاداء ہوتی ہے اور اگر کسی وجہ سے وہ تلف و ضائع ہو جائے اس کا تمام تر ذمہ دار مقروض ہوتا ہے اور پورا نقصان خود اسے برداشت کرنا پڑتا ہے قرض خواہ اس میں بالکل شریک نہیں ہوتا۔ فرق کی دوسری وجہ معاملہ ربوٰ اور معاملہ مضاربت کے مابین یہ ہے کہ معاملہ ربوٰ میں مقروض پر لازم ہوتا ہے کہ وہ قرض کے اصل مال کے ساتھ کچھ زائد بھی ضرور ادا کرے جب کہ معاملہ مضاربت میں عامل مضارب یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ

اصل مال کے ساتھ کچھ زائد بھی ضرور ادا کرے بلکہ اس میں یہ طے پاتا ہے کہ اگر نفع ہوا تو اس صورت میں رب المال کو نفع کا اتنا حصہ ملے گا اور نہ ہوا تو کچھ نہ ملے گا ۔ یہ ھیں وہ وجوہ جن کی بنا پر اسلام میں ربوٰ حرام و ناجائز اور مضاربت جائز ہے اور یہ کہ ربوٰ اس لئے حرام ہے کہ اس میں رباخور اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے چونکہ اس کا عوض موجود نہیں ھوتا جو اسے شرعاً اس کا حقدار ٹھہراتا ھو لہذا وہ اپنا نہیں بلکہ دوسرے کا حق لیتا اور معاشی ظلم کا مرتکب ھوتا ہے جو ھر دین میں حرام ہے ، بخلاف مضاربت کے کہ اس میں رب المال کی طرف سے اگرچہ حقیقی مال کی شکل میں نہیں لیکن مالی نقصان برداشت کرنے کی ذمہ داری اور آمادگی کی شکل میں عوض ضرور موجود ھوتا ہے جس کا شریعت میں اعتبار ہے۔ کیونکہ عدل پر مبنی یہ فقہی قاعدہ ہے کہ ,, الخراج بالضمان ،، اور الغنم للغرم ،، جس کا حاصل یہ کہ جو کسی معاملہ میں نقصان برداشت کرتا ہے وہ اس کے فائدے سے بھی بہرہ ور ھو سکتا ہے۔ لہذا مضاربت میں رب المال کے لئے نفع کی صورت میں نفع کے ایک حصہ کا لینا جائز ھو جاتا ہے ، رھی یہ بات کہ یہ جواز کس درجہ کا ھوتا اور کس درجہ کا نہیں ھوتا ، یہ الگ بحث ہے جسے میرے مقالے :,, مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت ،، میں دیکھا جا سکتا ہے جو بعض علمی رسائل میں چھپ چکا ہے۔

ربوٰ سے متعلق بحث میں ایک بات یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ھوگی کہ تحریم ربوٰ کے بارے میں بعض حضرات کا موقف یہ ہے کہ صرف ایسے قرضوں پر ربوٰ حرام ہے جو ذاتی اور نجی استعمال کی

اشیاء پر خرچ کرنے کی خاطر لئے دیئے گئے ہوں یعنی صرفی اور استہلا کی نوعیت کے قرضوں پر ، اور ان قرضوں پر ربٰو حرام نہیں جو پیدا آور مقاصد یعنی تجارت وغیرہ سے تعلق رکھتے اور کمانے کی غرض سے لئے دیئے جاتے ہیں بلکہ یہ حضرات اس قسم کے قرضوں پر زیادتی کو ربٰو سمجھتے ہی نہیں اور اسے نفع و پرافٹ کہتے ہیں۔

موقف مذکور اس وجہ سے درست نہیں کہ ربٰو کی حقیقت کا تعلق مطلق اور عام قرض سے ہے خواہ وہ کسی نوعیت کا بھی ہو اس میں پیداواری اور غیر پیداواری کی کوئی تخصیص نہیں نہ اس کا کوئی لحاظ ہے کہ قرض لینے والا کس مقصد سے قرض لے رہا ہے ، بہرحال قرض کے معاملہ میں قرض والی شئے قرض خواہ کی ملکیت سے نکل کر قرض دار کی ملکیت میں چلی جاتی ہے خواہ کوئی قرض بھی ہو ، اسی طرح قرض خواہ قرض کے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے بلاعوض ہونے کی وجہ سے کسی قسم کے قرض میں اس کے لئے اس زائد کا لینا حرام ہوتا ہے اور حرام ہونے کی علت ہر طرح کے قرض میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے یعنی دوسرے کا مال بغیر عوض کے لینا جس کا دوسرا نام ظلم ہے ، چونکہ قرض کے بارے میں شرعی قاعدہ یہ ہے کہ قرضدار اس سے جو بھی فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کے لئے بالکل ایسا ہوتا ہے جیسا کہ وہ اپنے کسی اور مال سے فائدہ اٹھاتا ہے یعنی وہ تمام تر اسی کے لئے ہوتا ہے ، قرض خواہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ، کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ قرض کے مال کے ساتھ تجارت وغیرہ کرکے قرض دار جو کماتا ہے وہ پورے کا پورا اس کا حق ہوتا ہے ، قرض خواہ کا اس میں ذرہ برابر

حق نہیں ہوتا لہذا تجارتی قرضے پر بھی وہ جو زائد لیتا ہے دوسرے کا حق لیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نزول قرآن کے وقت عرب معاشرے میں جس ربوٰ کا رواج تھا وہ زیادہ تر تجارتی نوعیت کے قرضوں سے تعلق رکھتی تھی بعض روایتوں میں اس کی تصریح ہے خود قرآن کریم کے ان کلمات میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے : فان تبتم فلکم رؤوس اموالکم لاتظلمون ولاتظلمون (۲۲) ۔ اگر تم ربوٰ کو چھوڑ دو اور تائب ہو جاؤ تو پھر تمہارے لئے صرف رأس المال یعنی اصل مال ہے نہ اس سے زائد لے کر تم دوسروں پر ظلم کرو اور نہ دوسرے تمہارا اصل مال روک کر تم پر ظلم کریں ۔ اور چونکہ رأس المال کا اطلاق زیادہ تر تجارتی مال پر ہوتا ہے لہذا اس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے جس ربوٰ کو حرام و ممنوع ٹھہرایا ہے وہ دونوں قسم کے قرضوں سے تعلق رکھتی ہے تجارتی قرضوں والی ربوٰ کو اس سے مستثنیٰ کرنا نہ عقلاً درست ہو سکتا ہے اور نہ نقلاً درست ، یہ بے دلیل اپنی ایک من گھڑت بات ہے جس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا ۔

مزید براں ان حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ پہلی قسم کے قرضوں پر بھی ربوٰ کی جو حرمت اور ممانعت ہے وہ انسانی ہمدردی اور اخلاق کے منافی ہونے کی وجہ سے ہے یعنی انسانی ہمدردی کا اخلاقی تقاضا ہے کہ جو لوگ ضروریات زندگی سے محروم ہوں اور ان کے پاس ابتدائی وسائل حیات اور اسباب زیست بھی نہ ہوں مالدار لوگ مفت ان کی معاشی مدد کریں یا بلاسود قرض حسنہ کے طور پر

ان کو مال دیں ، لہذا جو لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ ضرورت مند محتاجوں کو بھی سود پر قرض دیتے ھیں وہ اخلاقی لحاظ سے غلط کام کرتے ھیں جس کا نہ کرنا کرنے سے اچھا اور بہتر ھوتا ہے گویا ان حضرات کے نزدیک ربٰو کی تحریم اور ممانعت اخلاقی ہے قانونی نہیں اگر اس کی پابندی کی جائے تو بہتر اور نہ کی جائے تو کوئی جرم اور گناہ نہیں اور نہ اس پر کوئی مواخذہ اور تعزیر و سزا ہے حکومت کسی کو اس کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔

یہ خیال بھی اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن و حدیث میں ربا کی قباحت و برائی اور اس کی ممانعت کے متعلق جو واضح اور صریح نصوص ھیں ان سے خیال مذکور کی صاف اور قطعی نفی و تردید ھوتی ہے قرآن حکیم میں کسی جرم کے ارتکاب پر اتنی سخت وعید اور دھمکی نہیں جتنی ربٰو کے ارتکاب پر ہے فرمایا اس جرم کے مرتکب گویا اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ برسرپیکار اور مصروف جنگ ھیں اس کے علاوہ کچھ دوسری آیات اور احادیث پہلے ربٰو کے شرعی حکم کے بیان میں نقل کی جا چکی ھیں ان سب سے صاف ظاھر ھوتا ہے کہ ربٰو کی ممانعت کسی مکروہ عمل کی ممانعت نہیں جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر ھوتا ہے بلکہ ایک قطعی حرام فعل کی ممانعت ہے جس سے اجتناب کرنا لازمی و ضروری ھوتا ہے اور جس کی حیثیت واجب العمل قانون کی ھوتی ہے اور جس کے نفاذ اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر عائد ھوتی ہے اور جس کی خلاف ورزی موجب تعزیر اور سزا جرم سمجھی جاتی ہے۔

دراصل اخلاقی امور کا تعلق احسان سے اور قانونی امور کا تعلق

عـدل سے ہے احسان کے معنی ھیں اپنے حق کا دوسرا کے لئے تبرعاً ایثار کرنا اور اس کو وہ دینا جس کا کہ وہ حقدار نہیں جب کہ عـدل کے معنی ھیں دوسرے کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا دینا اور عـدل کی ضد اور نقیض ظلم ہے جس کے معنی ھیں دوسرے کی حق تلفی کرنا اور اس کا حق مارنا ، لہذا جو شرعی احکام عـدل و ظلم سے تعلق رکھتے ھیں ان کی نوعیت قانونی ھوتی ہے ، قرآنی تصریح کے مطابق چونکہ ربو کا تعلق ظلم سے ہے ، لہذا ممانعت ربٰو کی حیثیت قطعی طور پر قانونی ہے احسان پر مبنی اخلاقی نہیں۔

تحریم ربٰو کے بارے میں بعض حضرات کا موقف یہ بھی ہے کہ جو ربٰو اضعافاً مضاعفةً ھو وہ حرام و ممنوع ہے لیکن جو ایسی نہ ھو وہ حرام و ممنوع نہیں ، اضعافاً مضاعفةً کا مطلب یہ کہ جو ربٰو بڑھتے بڑھتے اصل سے کئی گنا زیادہ ھو جائے جسے آج کل عـربی میں ربٰو فاحش اور اردو میں سود مرکب کہتے ھیں اور مہاجنی بیاج بھی ، اور جو ربٰو معمولی اضافے سے تعلق رکھتی ھو مثلاً دس پندرہ فیصد سالانہ جیسے کہ عام طور پر بنکوں میں ہے وہ ناجائز اور ممنوع نہیں اور اس کے لین دین کی گنجائش ہے۔

ربٰو کے متعلق یہ موقف بھی درست نہیں کیونکہ جو شئے اپنی ذات ، فطرت اور ماھیت کے لحاظ سے قبیح اور بری ھو اس کی کثیر مقدار ھو یا قلیل مقدار ، قباحت و برائی میں برابر ھوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ جب کثیر مقدار میں ھو تو اس کے مضر اثرات بڑے پیمانہ پر اور جـلـد نمایـاں ھـوتے اور قلیل مقدار میں ھو تو اس کے برے اثرات چھوٹے پیمانہ پر اور دیر میں آشکار ھوتے ھیں لیکن یہ چیز اس کی

فطرت اور ماہیت سے خارج اور اوپری چیز ہے، ربوٰ چونکہ ظلم و حق تلفی کی وجہ سے حرام ہے جو اس کی ماہیت اور ذات کا جزء ہے، لہذا جس طرح اس کا ایک پیسہ حرام اور قبیح ہے اس طرح اس کا ایک روپیہ اور سو روپیہ بھی حرام و قبیح ہے کیونکہ نفس حق تلفی اور ظلم دونوں میں موجود ہے، مطلب یہ کہ دوسرے کا مال ناحق اور بلاعوض لینا ظلم ہے خواہ وہ ایک پیسہ ہو یا ایک روپیہ ہو یا سو روپیہ وغیرہ مال کی کمی و بیشی ظلم کی ماہیت میں داخل نہیں بلکہ صرف ناحق اور بلاعوض لینا اس کی ماہیت میں داخل ہے باقی یہ ظاہر ہے کہ کسی کا ایک پیسہ ناحق لیا جائے تو وہ اس سے اتنا متأثر اور آزردہ نہیں ہوتا جتنا کہ مثلاً سو روپے لینے سے متأثر اور آزردہ ہوتا ہے لیکن اس چیز کا نفس ظلم سے تعلق نہیں، بنا بریں اضعافاً مضاعفةً ربوٰ کو حرام و ناجائز اور غیر اضعافاً مضاعفةً کو حلال و جائز کہنا نہ نقل کی رو سے صحیح ہے اور نہ عقل کی رو سے صحیح -

پھر چونکہ شرعی احکام ضرور حکمتوں اور بندوں کی مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں کیونکہ جس اللہ کی طرف سے یہ احکام ہیں وہ حکیم اور رب رحیم ہے اس کا کوئی حکم حکمت اور بندوں کی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، لہذا آخر میں کچھ اس حکمت و مصلحت کے متعلق عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کے پیش نظر شریعت اسلام نے معاملہ ربوٰ کو حرام و ناجائز اور معاملہ بیع کو حلال و جائز ٹھہرایا ہے کیونکہ جب کسی معاملہ کے بارے میں اس کے شرعی حکم کی حکمت اور مصلحت معلوم ہو جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے دوسرے ایسے معاملات و مسائل کی شرعی

حیثیت کو جاننے میں مدد ملتی ہے جن کے متعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں جزوی صراحت کے ساتھ احکام مذکور نہیں ہوتے حالانکہ ان کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محققین علماء کرام جیسے علامہ ابوبکر الجصاصؒ ، علامہ ابو اسحاق الشاطبیؒ ، علامہ ابن القیم ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تحریم ربوٰ کی حکمت و مصلحت کے بارے میں جو لکھا ہے اس کے مطابق ربوٰ کو حرام قرار دینے کی حکمت و مصلحت اور اس کا مقصد و منشا یہ ہے کہ معاشرے سے وہ معاشی ظلم و استحصال دور ہو جو دوسرے کا مال بلاعوض لینے سے وجود میں آتا اور متعدد انفرادی و اجتماعی مفاسد کا سبب و ذریعہ بنتا ہے اور جس سے افراد معاشرہ کے باھمی تعلقات بگڑتے اور بدامنی و بے چینی کی فضا رونما ہوتی ہے یعنی اس سے ایسے حالات ظہور میں آتے ھیں جن میں کسی کو پائیدار سکون و اطمینان نہیں ملتا جو اسلام کا مطمح نگاہ ہے۔

اور معاملہ بیع کو حلال و جائز ٹھہرانے کی حکمت و مصلحت یہ کہ لوگوں کے درمیان اشیاء ضرورت کا تبادلہ عدل کے مطابق طے پائے ہر فریق معاملہ کو اس کی چیز کا صحیح عوض ملے جو اس کی حقیقی رضامندی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جس سے باھمی تعلقات میں پختگی اور خوشگواری پیدا ہوتی اور اجتماعی سکون و اطمینان وجود میں آتا ہے۔

قرآن حکیم کی بعض آیات میں ربوٰ کا ذکر بیع کے بالمقابل ہے : جیسے ,, احل اللہ البیع وحرم الربوٰ ،، ۔ اللہ نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام ٹھہرایا ، اور دوسری بعض آیات میں ربوٰ کے بالمقابل صدقات اور زکاۃ کا ذکر ہے جیسے ,, یمحق اللہ الربوٰ ویربی الصدقات (٢٣) ،،

الله ربو کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے ،، ۔ اور جیسے ،، وما اتیتم من رباً لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند الله ، وما اتیتم من زکاة تریدون وجہ الله فأولئک ھم المضعفون (۲۴) ،، اور وہ جو تم بطور ربو دیتے ھو کہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ھو تو وہ الله کے نزدیک اضافہ نہیں ھوتا ، اور وہ جو تم بطور زکاة دیتے ھو الله کی رضامندی چاھتے ھوئے تو یہ ھیں وہ لوگ جو اپنے مالوں کو کئی گنا بڑھانے والے ھیں ۔

ان قرآنی آیات میں تین چیزیں بیان ھوئی ھیں : ایک ربوٰ ، دوم بیع ، سوم صدقہ ، ربوٰ میں ایک فریق دوسرے کا مال بلاعوض لیتا ہے ، صدقہ میں ایک شخص اپنا مال دوسرے کو بلاعوض دیتا ہے اور بیع میں ھر فریق دوسرے کا مال عوض کے ساتھ لیتا ہے ، لہذا ربوٰ کی ضد بیع بھی ہے اور صدقہ بھی ، البتہ صدقہ اس کی کاملاً اور کلیةً ضد ہے کیونکہ اس میں کبھی ربوٰ کا کوئی شائبہ بھی نہیں ھو سکتا جب کہ بیع میں جھوٹ ، خیانت اور فریب سے ربوٰ کا رنگ پیدا ھو جاتا ہے اور پیدا ھو سکتا ہے ، اسی طرح ان تینوں میں ایک فرق یہ کہ ربوٰ کا تعلق ظلم سے ، بیع کا تعلق عدل سے اور صدقہ کا تعلق احسان سے ہے گویا ایک لکیر کے ایک سرے کا نام ظلم اور دوسرے سرے کا نام احسان ہے اور درمیانی نقطے کا نام عدل ہے جس طرح عدل اور احسان دونوں ظلم کی ضد ھیں اسی طرح بیع اور صدقہ دونوں ربوٰ کی ضد ھیں ، ظلم الله کے نزدیک انتہائی بری چیز ہے جب کہ صدقہ انتہائی اچھی چیز ہے اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ، اور بیع جب دیانت اور صداقت کے ساتھ ھو تو وہ بھی ایک نیکی اور اچھائی ہے ، الله

تعالی یہ چاہتا ہے کہ بندے عدل و احسان کی روش اختیار کریں اور ظلم و زیادتی سے کلیۃً بچیں اور ہمیشہ دور رہیں کیونکہ اسی سے ان کو دونوں جہاں کی کامیابی و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔

حــوالہ جات

١ ـ ابوبکر الجصاص ، احکام القرآن ، ج ١ ، ص ٥٥٢ ـ

٢ ـ ابوبکر الجصاص ، احکام القرآن ، ج ١ ، ص ٥٥٢

٣ ـ ابوبکر الجصاص ، احکام القرآن ، ج ١ ، ص ٥٥٣ ـ

٤ ـ امام فخر الدین الرازی ، التفسیر الکبیر ج ٧ ، ص ٩١

٥ ـ امام فخر الدین الرازی ، التفسیر الکبیر ج ٩ ص ٢

٦ ـ تیسر الوصول ج ١ ص ٤٧

٧ ـ طبری ، تفسیر الطبری ، ج ٣ ، ص ٦٧

٨ ـ ایضــاً

٩ ـ السیوطی ، الدر المنشور ، ج ٢ ، ص ٧١

١٠ ـ السیوطی ، الدر المنشور ، ج ٣ ، ص ٥٩

١١ ـ القرآن ٣ : ١٢٠

١٢ ـ القرآن ٢ : ٢٧٥

١٣ ـ ایضــاً ،

١٤ ـ القرآن ٢ : ٢٧٩

١٥ ـ القرآن ٣ : ١٣١

١٦ ـ القــرآن ٢٣ : ٣٧

١٧ - القـرآن ٦٣ : ٩

١٨ - القـرآن ٣ : ٢٩

١٩ - الجصاص ، احكام القرآن ، ج ١ ، ص ٥٥٢

٢٠ - علامه رشيد رضا ، تفسير المنار ، ج ٣ ، ص ١٠٨

٢١ - سيد قطب ، تفسير فى ,, ظلال القرآن ،، ج ٣ ، ص ٣٣

٢٢ - القـرآن ٢ : ٢٧٩

٢٣ - القـرآن ٢ : ٢٧٦

٢٤ - القـرآن ٣٠ : ٣٩